بیٹا؟ دو چار دن اور رہ کر اوکھ کی بوائی کرا لو اور کچھ لین دین کا حساب بھی ٹھیک کر لو تب جانا۔"

گوبر نے شان جماتے ہوئے کہا: "میرا دو تین روپئے روج (روز) کا گھاٹا ہو رہا ہے، یہ بھی سمجھتی ہو؟ یہاں میں بہت بہت کر کے چار آنے کی مجوری ہی تو کرتا ہوں! اور اب کی میں جھنیا کو بھی لیتا جاؤں گا۔ وہاں مجھے کھانے پینے کی بڑی تکلیپھ (تکلیف) ہوتی ہے۔"

دھنیا نے ڈرتے ڈرتے کہا: "جیسی تمہاری اچھا، مگر وہاں وہ کیسے اکیلے گھر سنبھالے گی۔ کیسے بچے کی دیکھ بھال کرے گی۔"

"اب بچے کو دیکھوں کہ اپنا سبھیتا دیکھوں۔ مجھ سے چولھا نہیں پھونکا جاتا۔"

"لے جانے کو میں نہیں روکتی، مگر پردیس میں بال بچوں کو لے کر، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، سوچو کتنا جھنجھٹ ہے۔"

"پردیس میں بھی ساتھی نکل ہی آتے ہیں اماں! اور یہ تو مطلب کی دنیا ہے۔ جس کے ساتھ چار پیسے گم کھاؤ وہی اپنا۔ کھالی (خالی) ہاتھ تو ماں باپ بھی نہیں پوچھتے۔"

دھنیا اس جملے کو سمجھ گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک جل اٹھی۔ بولی۔ "ماں باپ کو بھی تم نے انھیں پیسے کے یاروں میں سمجھ لیا۔"

"آنکھوں دیکھ رہا ہوں۔"

"نہیں دیکھ رہے ہو۔ ماں باپ کا دل اتنا کڑا نہیں ہوتا، ہاں لڑکے البتہ جہاں چار پیسے کمانے لگے کہ ماں باپ سے آنکھیں پھیر لیں۔ اسی گاؤں میں ایک دو نہیں، دس بیس کو دکھا دوں۔ ماں باپ اُدھار

لیتے ہیں تو کس کے لئے ؟ لڑکوں، لڑکیوں ہی کے لئے کہ اپنے آرام میں اڑانے کے لئے۔"

کیا جانے تم نے کس کے لئے ادھار لیا۔ میں نے تو ایک پیسہ بھی نہیں جانا۔"

"بنا پالے ہی اتنے بڑے ہو گئے ؟"

"پالنے میں تمہارا لگا ہی کیا ؟ جب تک بچہ تھا دودھ پلا دیا۔ پھر لاوارث کی طرح چھوڑ دیا۔ جو سب نے کھایا وہی میں نے کھایا۔ میرے لئے دودھ نہیں آتا تھا، مکھن نہیں آتا تھا اور اب تم بھی چاہتی ہو اور دادا بھی چاہتے ہیں کہ میں سارا دن (قرض) چکاؤں، لگان دوں اور لڑکیوں کا بیاہ کروں۔ جیسے میری جندگی (زندگی) تمہارا دینا بھرنے کے لئے ہے۔ میرے بھی تو بال بچے ہیں۔"

دھنیا سناٹے میں آگئی۔ ایک ہی لمحے میں اس کی زندگی کا میٹھا سپنا ٹوٹ سا گیا۔ اب تک وہ دل میں خوش تھی کہ اب اس کا دکھ درد سب دور ہو گیا۔ جب سے گوبر گھر آیا اس کے چہرے پر ہنسی کچھ کھیلتی سی رہتی تھی۔ اس کے کلام میں مٹھاس اور برتاؤ میں فراخ دلی آگئی تھی۔ بھگوان نے اس پر دیا کی تھی تو اسے سر جھکا کر چلنا چاہیئے۔ اندر کا سکون باہر کی شرافت بن گیا تھا۔ یہ الفاظ جلتے ہوئے بالو کی طرح دل پر پڑے اور چنے کی طرح سارے ارمان جھلس گئے۔ اس کا سارا گھمنڈ چور چور ہو گیا۔ اتنا سن لینے کے بعد اب زندگی میں کیا لطف رہ گیا۔ جس کشتی پر بیٹھ کر زندگی کے سمندر کو پار کرنا چاہتی تھی، جب وہی ٹوٹ گئی تو کس سکھ کے لئے جیے ؟

لیکن نہیں، اس کا گوبر اتنا مطلبی نہیں ہے۔ اس نے کبھی ماں کی

بات کا جواب نہیں دیا، کبھی کسی بات کے لئے ہٹ نہیں کی، جو کچھ روکھا سوکھا مل گیا وہی کھا لیتا تھا۔ وہی بھولا بھالا پریم کا پتلا آج کیوں ایسی دل توڑنے والی باتیں کہہ رہا ہے؟ اس کی طبیعت کے خلاف تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ماں باپ دونوں ہی اس کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ اس نے آپ ہی لین دین کی بات چلائی، ورنہ اس سے کون کہتا ہے کہ تو ماں باپ کا قرض ادا کر؟ ماں باپ کے لئے یہی کیا کم ہے کہ وہ عزت آبرو کے ساتھ بھلے لوگوں کی طرح کماتا کھاتا ہے۔ اس سے کچھ ہو سکے تو ماں باپ کی مدد کرے، نہیں ہو سکتا تو ماں باپ اس کا گلا نہ دبائیں گے، جھنیا کو لے جانا چاہتا ہے تو خوشی سے لے جائے دھنیا نے تو صرف اس کی بھلائی کے خیال سے کہا تھا کہ جھنیا کو وہاں لیجانے میں اسے جتنا آرام ملے گا۔ اس سے کہیں زیادہ جھنجٹ بڑھ جائے گا۔ اس میں ایسی کون سی لگنے والی بات تھی کہ وہ اتنا بگڑ اٹھا۔ ہو نہ ہو یہ آگ جھنیا نے لگائی ہے۔ وہی بیٹھے بیٹھے اسے یہ منتر پڑھا رہی ہے۔ یہاں بناؤ سنگار کرنے کو نہیں ملتا، گھر کا کچھ نہ کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے، وہاں روپئے پیسے ہاتھ میں آئیں گے تو آرام سے اچھا کھائے گی، اچھا پہنے گی اور پاؤں پھیلا کر سوئے گی۔ دو آدمیوں کی روٹی پکانے میں کیا لگتا ہے۔ وہاں تو پیسہ چاہیئے۔ سنا ہے کہ ہاٹ میں پکی پکائی روٹیاں مل جاتی ہیں۔ یہ سارا بکھیڑا اسی نے کھڑا کیا ہے سہر میں کچھ دنوں تو رہ بھی چکی ہے، وہاں کا دانہ پانی منہ لگا ہوا ہے، یہاں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ یہ بھوندو مل گیا تو اسے پھنسا لیا۔ جب جب یہاں پانچ مہینے کا پیٹ لے کر آئی تھی تب کیسا بیاؤں میاؤں کرتی تھی۔ تب یہاں ٹھکانا نہ ملا ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتی پھرتی۔ یہ اسی نیکی کا بدلہ ہے! اسی چڑیل کے پیچھے ڈنڈ دینا پڑا، برادری میں بدنامی ہوئی،

کھیتی ٹوٹی، ساری درگت ہوئی، آج یہ چڑیل جس تل میں کھاتی ہے۔ اسی میں چھید کر رہی ہے۔ پیسے دیکھے تو آنکھ ہوگئی۔ تب ہی اینٹھی اینٹھی پھرتی ہے، مجاج نہیں ملتا۔ آج لڑکا چار پیسے کمانے لگا ہے نا۔ اتنے دنوں بات نہیں پوچھی تو ساس کے پانوں دبانے کے لئے تیل لئے دوڑتی تھی۔ ڈائن، اس کی جندگی کی پونجی کو اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔

دکھ بھری آواز میں بولی: یہ منتر تمہیں کون دے رہا ہے جیا؟ تم تو ایسے نہ تھے۔ ماں باپ تمہارے ہی ہیں، بہنیں تمہاری ہی ہیں، گھر تمہارا ہی ہے، یہاں باہر کا کون ہے؟ اور ہم کیا بہت دن بیٹھے رہیں گے؟ گھر کی آبرو بنائے رہو گے تو تم ہی کو سکھ ہوگا۔ آدمی گھر والوں ہی کے لئے پیسہ کماتا ہے کہ اور کسی کے لئے۔ اپنا پیٹ تو سور بھی پال لیتی ہے۔ میں نہ جانتی تھی کہ جھنیا ناگن بن کر ہم ہی کو ڈسے گی۔"

گوبر نے بگڑ کر کہا: اماں، میں نادان نہیں ہوں کہ جھنیا مجھے منتر پڑھائے تم اسے ناحق (ناحق) کوس رہی ہو۔ تمہاری گرستی کا میں سارا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا تمہاری مدد کروں گا۔ پر اپنے پانوں بیڑیاں نہیں ڈال سکتا۔"

جھنیا بھی کوٹھری سے نکل کر بولی: اماں، جلاہے کا گصہ (غصہ) ڈاڑھی پر نہ اتارو۔ کوئی بچہ نہیں ہے کہ میں پھوڑ لوں گی۔ اپنا بُرا بھلا سب سمجھتے ہیں آدمی اس لئے جنم لیتا ہے کہ عمر بھر پیسا کرتا رہے۔ اور ایک دن چھوچھے ہاتھ مرجائے۔ سب جینے کا سکھ چاہتے ہیں۔ سب کا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ میں چار پیسے ہوں۔"

دھنیا نے دانت پیس کر کہا: بہت گیان نہ بگھار! آج تو بھی اپنا

بھلا برا سوچنے لایک (لائق) ہو گئی ہے۔ یہاں اگر میرے پانوں پر سر رکھ کر رو رہی تھی تب اپنا بھلا برا نہیں سوجھا تھا؟ اس گھڑی ہم بھی اپنا بھلا بُرا سوچنے لگتے تو آج تیرا پتہ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد جنگ چھڑ گئی۔ طعنے مہنے، گالی گلوچ، تکا فضیحت، کوئی بات نہ بچی۔ گوبر بھی بیچ بیچ میں ڈنک مارتا جاتا تھا۔ ہوری برو ٹھے میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ سونا اور روپا آنگن میں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ دلاری، پینا اور کئی عورتیں بیچ بچاؤ کرنے آ پہنچی تھیں۔ گرج کہ درمیان میں کبھی کبھی بوندیں بھی پڑجاتی تھیں۔ دونوں ہی اپنے اپنے بھاگ کو رو رہی تھیں۔ دونوں ہی ایشور کو کوس رہی تھیں اور دونوں ہی اپنا اپنا بے قصور ہونا ثابت کر رہی تھیں۔ جھنیا گڑے مردے اکھاڑ رہی تھی۔ آج اسے ہیرا اور سوجھا سے خاص ہمدردی ہو گئی تھی۔ جنھیں دھنیا نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ دھنیا کی آج تک کسی سے نہیں پٹی تو جھنیا سے کیسے پٹ سکتی ہے؟ دھنیا اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ لوگوں کی رائے جھنیا کی طرف تھی۔ شاید اس لئے کہ جھنیا ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی اور دھنیا آپے سے باہر تھی، شاید اس لئے بھی جھنیا اب کمانے والے مرد کی بیوی تھی۔ اور اسے خوش رکھنا زیادہ قرین مصلحت تھا۔

تب ہوری نے آنگن میں آکر کہا: "میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں دھنیا، چپ رہ! میرے منہ میں کالکھ نہ لگا۔ ہاں ابھی جی نہ بھرا ہو تو اور سُن۔"

دھنیا پھنکارتی ہوئی ادھر دوڑی: "تم بھی موٹی ڈال پکڑنے چلے ہیں ہی دوکھی ہوں، وہ تو میرے اوپر پھول برسا رہی ہے۔"

جنگ کا میدان بدل گیا۔

"جو چھوٹوں کے منہ لگے وہ چھوٹا۔"

دھنیا کس دلیل سے جھنیا کو چھوٹا مان لے۔

ہوری نے رنجیدگی سے کہا: "اچھا وہ چھوٹی نہیں بڑی سہی۔ جو آدمی نہیں رہنا چاہتا تو کیا اسے باندھ کر رکھے گی؟ ماں باپ کا دھرم ہے لڑکے کو پال پوس کر بڑا کر دینا۔ وہ ہم کر چکے۔ ان کے ہاتھ پاؤں ہو گئے۔ اب تو کیا چاہتی ہے کہ وہ دانہ چارا لا کر تجھے کھلا دیں؟ ماں باپ کا دھرم سولہوں آنے لڑکوں کے ساتھ ہے، لڑکوں کا ماں باپ کے ساتھ ایک آنہ بھی دھرم نہیں ہے۔ جو جاتا ہے اسے اسیس دے کر بدا (رخصت) کر دے۔ ہمارا بھگوان مالک ہے۔ جو کچھ بھوگنا بدا ہے بھوگیں گے۔ چالیس سات، سینتالیس اسی طرح روتے روتے کٹ گئے، دس پانچ سال ہیں سو وہ بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔"

ادھر گوبر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب اس گھر کا پانی بھی اس کے لئے حرام ہے۔ ماں ہو کر جب اسے ایسی ایسی باتیں کہے تو اب وہ اس کا منہ بھی نہ دیکھے گا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا بستر بندھ گیا۔ جھنیا نے بھی چوندری پہن لی، منو بھی ٹوپ اور فراک پہن کر "راجہ" بن گیا۔

ہوری نے بھرے گلے سے کہا: "بیٹا، تم سے کچھ کہنے کا منہ تو نہیں ہے، پر جی نہیں مانتا۔ کیا جرا (ذرا) جا کر اپنی ابھاگنی ماتا کے پاؤں چھو لوگے تو کچھ برا ہو گا؟ جس ماتا کی کوکھ (بطن) سے جنم لیا اور جس کا لو ہو (لہو) پی کر پلے ہو کیا اس کے ساتھ اتنا بھی نہیں کر سکتے؟"

گوبر نے منہ پھیر کر کہا: "میں اسے اپنی ماتا نہیں سمجھتا۔"

ہوری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "جیسی تمہاری اچھا۔ جہاں رہو سکھی رہو۔"

جھنیا نے ساس کے پاس جاکر اس کے پیروں کو آنچل سے چھوا۔ دھنیا کے منہ سے دعا کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں گوبر بچے کو گود میں لئے آگے آگے تھا اور جھنیا بستر بغل میں دبائے پیچھے پیچھے۔ ایک چمار کا لڑکا صندوق لئے ہوئے تھا۔ گاؤں کے کئی عورت مرد گوبر کو پہنچانے گاؤں کے باہر تک گئے۔

اور دھنیا بیٹھی رو رہی تھی، جیسے کوئی اس کے دل کو آرے سے چیر رہا ہو۔ اس کی مامتا اس گھر کے مانند ہو رہی تھی، جس میں آگ لگ گئی ہو اور اب کچھ جل کر خاک ہو گیا ہو۔ بیٹھ کر رونے کے لئے بھی جگہ نہ بچی ہو۔

(۲۲)

ادھر کچھ دنوں سے رائے صاحب کی لڑکی کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ چناؤ بھی سر پر آ پہنچا تھا مگر ان سب سے زیادہ ضروری انھیں دیوانی کا ایک مقدمہ دائر کرنا تھا۔ جس کی کورٹ فیس ہی پچاس ہزار ہونی تھی۔ اور اوپر سے خرچ الگ۔ رائے صاحب کے سالے جو اپنی ریاست کے واحد مالک تھے عین شباب میں موٹر کے لڑ جانے سے فوت ہو گئے تھے اور رائے صاحب اپنے کنوارے لڑکے کی طرف سے اس ریاست پر قبضہ پانے کے لئے قانون کی پناہ لینا چاہتے تھے۔ ان کے چچازاد سالوں نے ریاست پر قبضہ کر رکھا تھا اور رائے صاحب کو اس میں سے کوئی حصہ دینے پر تیار نہ تھے۔ رائے صاحب نے بہت چاہا کہ باہمی مفاہمت و مصالحت ہو جائے اور ان کے چچازاد سالے معقول گزارہ لے کر ہٹ جائیں، حتیٰ کہ وہ ریاست کی نصف آمدنی چھوڑنے پر راضی تھے۔ مگر ان کے سالوں نے کسی طرح کا سمجھوتہ منظور نہ کیا اور صرف طاقت کے زور سے ریاست میں تحصیل وصول شروع کر دی۔ رائے صاحب کو عدالت جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مقدمے میں لاکھوں کا خرچ تھا مگر ریاست بھی بیس لاکھ سے کم مالیت کی نہ تھی۔ وکلاء نے یقینی طور سے کہہ دیا تھا کہ آپ کی شرطیہ ڈگری ہو گی۔ ایسا موقع کون چھوڑ سکتا تھا؟ مشکل یہی تھی کہ یہ تینوں کام ایک ساتھ آ پڑے تھے اور انھیں کسی طرح ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی اور صرف ہاتھ میں روپیہ نہ رہنے کے سبب اس کا بیاہ ٹلتا جاتا تھا خرچ کا اندازہ ایک لاکھ تھا جس کے پاس جاتے وہی بڑا سا منہ کھولتا،

حال میں ایک بڑا اچھا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ کنور دگ وجے سنگھ کی بیوی تپ دق کی نذر ہو چکی تھی اور کنور صاحب اپنے اجڑے گھر کو جلد سے جلد آباد کر لینا چاہتے تھے۔ سودا بھی کفایت سے طے ہو گیا اور کہیں شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے اسی لئے اسی لگن میں بیاہ ہونا نہایت ضروری تھا۔ کنور صاحب نفس پرستیوں کے غلام تھے۔ شراب، گانجا، افیون، مدک، چرس، ایسا کوئی نشانہ تھا جس کے عادی نہ ہوں اور عیاشی تو رئیس کی زینت ہی ہے۔ وہ رئیس ہی کیا جو عیاش نہ ہو؟ روپیہ اور خرچ ہی کیسے کیا جائے؟ مگر ان سب بری عادتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان میں وہ قابلیت تھی کہ بڑے بڑے علماء اُن کا لوہا مانتے تھے۔ موسیقی، ناٹک، ہاتھ دیکھنا، جوتش، لاٹھی، کشتی نشانہ بازی وغیرہ فنوں میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بڑے دبدبے والے اور بیخوف تھے۔ قومی تحریکوں میں دل کھول کر مدد دیتے تھے، مگر پوشیدہ طریقے پر۔ حکام سے یہ بات چھپی نہ تھی پھر بھی ان کی بڑی عزت تھی اور سال میں دو ایک بار گورنر صاحب بھی ان کے مہمان ہوتے تھے۔ عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور صحت تو ایسی تھی کہ تنہا ایک بکرا کھا کر ہضم کر ڈالتے تھے۔ رائے صاحب نے سمجھا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ابھی کنور صاحب سولہواں وغیرہ سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ رائے صاحب نے گفتگو شروع کر دی۔ کنور صاحب کے لئے بیاہ صرف اپنا اثر اور زور بڑھانے کا ذریعہ تھا۔ رائے صاحب کونسل کے ممبر تھے ہی، یوں بھی با اثر تھے۔ قومی جنگ میں اپنا تیاگ دکھلا کر عقیدت عامہ کے مستحق بھی بن چکے تھے۔ بیاہ طے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سکتی تھی اور وہ طے بھی ہو گیا۔

رہا چناؤ، وہ سونے کی کٹار تھی جسے نہ اُگلتے بنتا تھا نہ نگلتے۔ اب تک وہ

دو مرتبہ چنے جا چکے تھے اور دونوں ہی مرتبہ ان پر ایک ایک لاکھ کی چپت پڑ چکی تھی۔ مگر اب کے ایک راجہ صاحب اسی علاقے سے کھڑے ہو گئے تھے اور ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کر دیا تھا کہ چاہے ایک ایک ووٹر کو ایک ایک ہزار ہی کیوں نہ دینا پڑے اور چاہے پچاس لاکھ کی ریاست برد ہو جائے مگر رائے صاحب امر پال سنگھ کو کونسل میں نہ جانے دوں گا اور ان سے حکام نے اپنی امداد کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ رائے صاحب فہیم تھے، چالاک تھے اور اپنا نفع نقصان سمجھتے تھے مگر راجپوت تھے اور رئیس تھے، یہ چیلنج پا کر میدان سے کیسے ہٹ جائیں؟ یوں ان راجہ سورج پرتاب سنگھ نے آ کر کہا ہوتا کہ بھائی صاحب آپ تو دوبارہ کونسل میں جا چکے، اب کے مجھے جانے دیجئے تو شاید رائے صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا ہوتا۔ کونسل کا لالچ اب انھیں نہ تھا مگر اس چیلنج کے سامنے خم ٹھوکنے کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔ ایک مصلحت اور تھی۔ مسٹر ٹنخا نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ آپ کھڑے ہو جائیں۔ پھر بعد کو راجہ صاحب سے ایک لاکھ کی تھیلی لے کر بیٹھ جائے گا۔ انھوں نے یہاں تک کہا تھا کہ راجہ صاحب بڑی خوشی سے ایک لاکھ دے دیں گے، میری ان سے بات چیت ہو چکی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ راجہ صاحب رائے صاحب کو ہرانے کا افتخار نہیں چھوڑنا چاہتے اور اس کا خاص سبب تھا۔ رائے صاحب کی لڑکی کی شادی کا کنور صاحب سے طے ہونا۔ دوبا اثر گھرانوں کا میل، وہ اپنی شان کے لئے مضر سمجھتے تھے۔ ادھر رائے صاحب کو سسرالی جائداد ملنے کی قوی امید تھی، راجہ صاحب کے پہلو میں یہ کانٹا بھی بری طرح کھٹک رہا تھا کہیں وہ جائداد انھیں مل گئی اور قانون رائے صاحب کے موافق تھا ہی، تب تو راجہ صاحب کا ایک مدمقابل کھڑا ہو جائے گا۔ پس ان کا یہ فرض تھا کہ

وہ رائے صاحب کو کچل ڈالیں اور ان کی عزت خاک میں ملا دیں۔

بیچارے رائے صاحب بڑے سنکٹ میں پڑ گئے تھے۔ انھیں یہ شک ہونے لگا تھا کہ مسٹر ٹنخا نے صرف اپنا مطلب نکالنے کے لئے انھیں دھوکا دیا یہ خبر بھی ملی تھی کہ اب وہ راجہ صاحب کے پیروکار ہو گئے ہیں۔ یہ رائے صاحب کے زخم پر نمک تھا۔ انھوں نے کئی بار ٹنخا کو بلایا تھا مگر وہ یا تو گھر پر ملتے ہی نہ تھے یا آنے کا وعدہ کر کے بھول جاتے تھے۔ آخر آج وہ خود ان سے ملنے کا ارادہ کر کے ان کے یہاں جا پہنچے۔ اتفاق سے ٹنخا گھر پر مل گئے۔ مگر رائے صاحب کو پورے گھنٹہ بھر تک ان کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ وہی ٹنخا ہیں جو رائے صاحب کے دروازے پر روزانہ ایک بار حاضری دیا کرتے تھے۔ آج اتنا مزاج ہو گیا ہے، چلے بیٹھے تھے۔ جیوں ہی مسٹر ٹنخا آراستہ پیراستہ ہو کر منہ میں سگار دبائے ہوئے کمرے میں آئے اور ہاتھ بڑھایا کہ رائے صاحب نے بم چھوڑ دیا:

"میں گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور آپ نکلتے نکلتے اب نکلے ہیں! میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔"

ٹنخا نے ایک صوفے پر بیٹھ کر بے پروائی سے دھواں اڑاتے ہوئے کہا: "مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں ایک ضروری کام میں لگا ہوا تھا۔ آپ کو فون کر کے مجھ سے وقت طے کر لینا چاہیئے تھا۔"

آگ میں گھی پڑ گیا، مگر رائے صاحب نے غصہ کو ضبط کیا۔ وہ لڑنے نہ آئے تھے۔ اس توہین کو پی ہی جانے کا موقع تھا، بولے: "ہاں یہ غلطی ہوئی آج کل آپ کو بہت کم فرصت رہتی ہے شاید؟"

"جی ہاں بہت کم، ورنہ میں ضرور آتا۔"

"میں اسی معاملے کے بارے میں آپ سے پوچھنے آیا تھا۔ سمجھوتے

کی تو کوئی امید نہیں معلوم ہوتی۔ ادھر تو لڑائی کی تیاریاں بہت زوروں سے ہو رہی ہیں۔"

راجہ صاحب کو تو آپ جانتے ہیں، جھکڑ آدمی ہیں۔ پورے سنکی! کوئی نہ کوئی دھن سوار رہتی ہے۔ آج کل یہی دُھن ہے کہ رائے صاحب کو نیچا دکھا کر رہیں گے اور انھیں جب ایک دُھن سوار ہو جاتی ہے تو پھر کسی کی نہیں سنتے، خواہ کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ کوئی چالیس لاکھ کا بار سر پر ہے پھر بھی وہی دم خم ہے۔ وہی آنا پ شنا پ خرچ ہے۔ پیسے کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ نوکروں کی تنخواہ چھ چھ مہینے سے پڑی ہے۔ مگر ہیرا محل بن رہا ہے سنگ مرمر کا تو فرش ہے۔ بچی کاری ایسی ہوئی ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ افسروں کے پاس روز ڈالیاں جاتی رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ کوئی انگریز منیجر رکھنے والے ہیں۔"

"پھر آپ نے کیسے کہہ دیا تھا کہ آپ کوئی سمجھوتہ کرا دیں گے؟"

"مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ اس کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا؟ اگر کوئی شخص اپنے دو چار لاکھ روپئے پھونکنے ہی پر تلا ہوا ہے تو میرا کیا بس؟"

رائے صاحب اب غصّے کو ضبط نہ کر سکے، بولے: "خصوصاً جب اس دو چار لاکھ میں سے دس بیس ہزار آپ کے ہتھے چڑھنے کی بھی اُمید ہو۔"

تنخا اب کیوں دیتے؟ بولے: رائے صاحب! اب صاف صاف نہ کہلائیے۔ یہاں نہ میں سینا سی ہوں نہ آپ۔ ہم سب ہی کچھ نہ کچھ کمانے نکلے ہیں۔ آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش آپ کو بھی اتنی ہی ہے جتنی مجھ۔ آپ سے میں نے کھڑے ہونے کو کہا۔ آپ ایک لاکھ کے لالچ سے کھڑے ہو گئے اگر گوٹی لال ہو جاتی تو آج آپ ایک لاکھ کے مالک ہوتے اور بلا ایک پائی قرض لئے

بہادر صاحب سے رشتہ بھی قائم ہوجاتا اور مقدمہ بھی دائر ہوجاتا۔ مگر آپ بدقسمتی سے وہ چال پٹ پڑ گئی جب وہی یوں رہ گئے تو مجھے کیا ملتا؟ آخر میں نے جھک مار کر اُن کی دم پکڑی۔ کسی نہ کسی طرح اس بَیتَرنی کو تو پار کرنا ہی ہے۔"

رائے صاحب کو ایسا غصہ آرہا تھا کہ اس بدمعاش کو گولی مار دیں اسی نے سبز باغ دکھا کر کھڑا کیا اور اب اپنی صفائی دے رہا ہے، پیٹھ میں دھول بھی لگنے دیتا! مگر اب موقع و محل دیکھ کر زبان بند کئے ہوئے تھے۔

"تو اب آپ کے کئے کچھ نہیں ہوسکتا"

"ایسا ہی سمجھئے"

"میں پچاس ہزار پر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں"

"راجہ صاحب کسی طرح نہ مانیں گے"

"پچیس ہزار پر تو مان جائیں گے"

"کوئی امید نہیں۔ وہ صاف کہہ چکے ہیں"

"وہ کہہ رہے ہیں یا آپ کہہ رہے ہیں"؟

"آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں"

رائے صاحب نے انکسار سے کہا "میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، مگر اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ آپ چاہتے تو معاملہ ہوجاتا۔

"تو آپ کا خیال ہے کہ میں نے معاملہ ہونے نہیں دیا"

"نہیں میرا مطلب نہیں ہے۔ میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ چاہتے تو کام ہوجاتا اور میں اس پریشانی میں نہ پڑتا"

ٹُنّا نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تو رائے صاحب اگر آپ صاف کہلانا چاہتے ہیں تو سنئے۔ اگر آپ نے دس ہزار کا چیک میرے ہاتھ میں رکھ دیا ہوتا تو آج یقیناً ایک لاکھ کے مالک ہوتے۔ آپ شاید چاہتے ہوں گے کہ جب آپ کو راجہ صاحب سے روپئے مل جاتے تو آپ مجھے ہزار دو ہزار دے دیتے۔ تو میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ آپ راجہ صاحب سے روپئے لے کر سیف (آہنی صندوق) میں رکھتے اور مجھے انگوٹھا دکھا دیتے۔ پھر میں آپ کا کیا بنا لیتا، بتلایئے؟ کہیں نالش فریاد بھی تو نہ کر سکتا تھا!"

رائے صاحب نے جیسے چوٹ کھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ "آپ مجھے اتنا بے ایمان سمجھتے ہیں؟"

ٹُنّا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: "اسے بے ایمانی کون سمجھتا ہے آج کل یہی چالاکی ہے کہ کیسے دوسروں کو اُلّو بنایا جائے۔ یہی کامیاب طریقہ ہے اور آپ اس کے اُستادِ کامل ہیں۔"

رائے صاحب نے مٹھی باندھ کر کہا "میں"؟

"جی ہاں، آپ! پہلے چناؤ میں میں نے دل و جان سے آپ کی پیروی کی تو آپ نے بڑی مشکل سے رو دھو کر پانچ روپئے دیئے۔ پھر دوسرے چناؤ میں آپ نے ایک سڑا گلا، ٹوٹا پھوٹا، موٹر دے کر اپنا گلا چھڑایا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔"

وہ کمرے سے نکل گئے اور موٹر لانے کا حکم دیا۔

رائے صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ اس بدتہذیبی کی بھی کوئی حد ہے ایک تو گھنٹہ بھر انتظار کرایا اور اب اتنی بے مروتی سے پیش آکر انھیں

جبراً گھر سے نکال رہا ہے۔ اگر انھیں یقین ہوتا کہ وہ مسٹر ٹنخا کو پٹک سکتے ہیں تو کبھی نہ چوکتے۔ مگر ٹنخا قد و قامت میں آن سے سوا گنا تھے۔ جب ٹنخا نے ہارن بجایا تو یہ بھی آکر اپنے موٹر میں بیٹھے اور سیدھے مسٹر کھنّا کے پاس پہنچے۔

نو بج رہے تھے مگر کھنّا صاحب خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے وہ دو بجے رات کے پہلے کبھی نہ سوتے تھے اور پھر قدرتاً نو بجے دن تک سوتے رہتے تھے۔ یہاں بھی رائے صاحب کو آدھ گھنٹے بیٹھنا پڑا۔ اس لئے جب کوئی ساڑھے نو بجے مسٹر کھنّا مسکراتے ہوئے نکلے تو رائے صاحب نے ڈانٹ بتائی "اچھا اب سرکار کی آنکھ کھلی ہے، ساڑھے نو بجے! روپئے جمع کر لئے ہیں نا، جبھی بے فکری ہے۔ میری طرح تعلقدار ہوتے تو اب تک آپ بھی کسی کے دروازے پر کھڑے ہوتے۔ بیٹھے بیٹھے سر میں چکر آجاتا۔"

کھنّا نے سگرٹ کیس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "رات سونے میں بڑی دیر ہوگئی۔ اس وقت کدھر سے آرہے ہیں؟"

رائے صاحب نے تھوڑے سے لفظوں میں اپنی ساری مشکلیں بیان کر دیں۔ دل میں کھنّا کو گالیاں دیتے تھے جوان کا ہم سبق ہو کر بھی ہمیشہ انھیں ٹھگنے کی فکر میں رہتا تھا، مگر سامنے اس کی خوشامد کرتے تھے۔

کھنّا نے ایسی شکل بنائی گویا انھیں بڑی تشویش ہوگئی۔ بولے "میری تو صلاح ہے کہ آپ چناؤ کو گولی ماریں اور اپنے سالوں پر مقدمہ دائر کریں رہا بیاہ وہ تو تین دن کا تماشا ہے۔ جس کے لئے زیر بار ہونا مناسب نہیں۔ کنور صاحب میرے دوستوں میں ہیں۔ پس لینے دینے کا کوئی سوال نہ اٹھنے پائے گا۔"

رائے صاحب نے طنز سے کہا: "آپ یہ بھولے جاتے ہیں مسٹر کھنّا میں بینکر نہیں، تعلقدار ہوں۔ کنور صاحب جہیز نہیں مانگتے انہیں الشیو نے سب کچھ دیا ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ میری اکیلی لڑکی ہے اور اس کی ماں مرچکی ہے۔ وہ آج زندہ ہوتی تو شاید سارا گھر لٹا کر بھی اس کا جی نہ بھرتا، اس وقت میں شاید اُسے ہاتھ روک کر خرچ کرنے کا حکم دیتا۔ لیکن اب تو میں ماں بھی ہوں، باپ بھی ہوں۔ اور اگر مجھے اپنے دل کا خون بھی نکال کر دینا پڑے تو میں خوشی سے دوں گا۔ اس مجرد زندگی میں میں نے اولاد کی محبت ہی میں اپنے دل کی پیاس بجھائی ہے، دونو بچوں کے پیار ہی میں میں نے متوفیہ کے متعلق اپنی وفا شعاری کو نبھایا ہے۔ میرے لئے ناممکن ہے کہ اس مبارک موقع پر اپنے دل کے ارمان نہ نکالوں۔ میں اپنے دل کو تو سمجھا سکتا ہوں مگر جسے میں متوفیہ کا حکم سمجھتا ہوں اُسے نہیں ٹال سکتا۔ اور چناؤ کے میدان سے بھاگنا بھی میرے لئے ناممکن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہاروں گا، راجہ صاحب سے میرا کوئی مقابلہ نہیں ہے، پھر راجہ صاحب کو اتنا ضرور دکھا دینا چاہتا ہوں کہ امر پال سنگھ کوئی ملائم چارہ نہیں ہے۔"

اور مقدمہ دائر کرنا تو ضروری ہی ہے۔"

"اسی پر تو سارا دارومدار ہے۔ اب آپ بتائیے کہ آپ میری کیا مدد کرسکتے ہیں۔؟"

"میرے ڈائرکٹروں کا اس بارے میں جو حکم ہے، آپ جانتے ہی ہیں۔ اور راجہ صاحب بھی ہمارے ڈائرکٹر ہیں، یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہے پچھلا روپیہ وصول کرنے کے لئے بار بار تاکید ہو رہی ہے، کوئی نیا معاملہ تو شاید ہی ہوسکے۔"

رائے صاحب نے اُداس ہو کر کہا "آپ تو میری ناؤ ہی ڈبائے دیتے ہیں مسٹر کھنّا!"

"میرے پاس جو کچھ اپنا ہے وہ آپ کا ہے، مگر بینک کے معاملے میں تو مجھے مالکوں کا حکم ہی ماننا پڑے گا۔"

اگر یہ جائداد ہاتھ آگئی، جس کی مجھے پوری اُمید ہے تو میں پائی پائی ادا کر دوں گا۔"

"آپ بتلا سکتے ہیں اس وقت آپ پر کتنا قرض ہے؟"

رائے صاحب نے ہچکچاتے ہوئے کہا "پانچ لاکھ سمجھئے، کچھ کم ہی ہوگا۔"

کھنّا نے بے اعتباری سے کہا "یا تو آپ کو یاد نہیں یا آپ چھپا رہے ہیں۔"

رائے صاحب نے زور دے کر کہا "جی نہیں، میں نہ بھولا ہوں اور نہ چھپا رہا ہوں۔ میری جائداد اس وقت کم از کم پچاس لاکھ کی ہے اور سسرال کی جائداد بھی اس سے کم نہیں ہے۔ اتنی جائداد پر دس پانچ لاکھ کا بار کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"مگر یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سسرال والی جائداد پر قرض نہیں ہے؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بالکل بے داغ ہے۔"

"اور مجھے یہ خبر ملی ہے کہ اس پر دس لاکھ سے کم کا بار نہیں ہے۔ اُس جائداد پر تو اب کچھ ملنے سے رہا اور آپ کی جائداد پر بھی میرے خیال میں دس لاکھ سے کم قرض نہیں ہے۔ اور وہ جائداد اب پچاس لاکھ کی نہیں بلکہ مشکل سے پچیس لاکھ کی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی بینک آپ کو قرض نہیں دے سکتا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ایک ہلکی سی ٹھوکر آپ کو تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی ہے۔ آپ کو اس وقت بہت سنبھل کر چلنا چاہئے۔"

رائے صاحب نے ان کا ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر کہا "میرے دوست! یہ سب میں خوب سمجھتا ہوں! مگر زندگی کی ٹریجیڈی اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ کا دل جو کام نہیں کرنا چاہتا وہ آپ کو کرنا پڑے۔ آپ کو اس موقع پر میرے لئے کم سے کم دو لاکھ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

کھنّا نے لمبا سانس لے کر کہا "مائی گاڈ! دو لاکھ! غیر ممکن، بالکل غیر ممکن!

"میں تمہارے دروازے پر سر پٹک کر جان دے دوں گا، کھنّا، اتنا سمجھ لو، میں نے تمہارے بھروسے یہ سارے منصوبے باندھے ہیں۔ اگر تم نے مایوس کر دیا تو شاید مجھے زہر کھا لینا پڑے۔ میں سورج پرتاب سنگھ کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک سکتا۔ لڑکی کا بیاہ ابھی دو چار مہینے ٹل سکتا ہے، مقدمہ دائر کرنے کے بھی ابھی کافی وقت ہے، مگر چناؤ سر پہ آگیا اور مجھے سب سے بڑی فکر یہی ہے۔"

"کھنّا نے حیرت سے کہا "تو آپ چناؤ میں دو لاکھ لگا دیں گے؟"

چناؤ کا سوال نہیں ہے بھئی، یہ عزت کا سوال ہے۔ کیا آپ کی رائے میں میری عزت دو لاکھ کی بھی نہیں؟ میری ساری ریاست بک جائے اس کا غم نہیں، مگر سورج پرتاب سنگھ کو میں آسانی سے جیتنے نہ دوں گا۔"

کھنّا نے ایک منٹ تک دھواں اڑانے کے بعد کہا "بینک کی جو حالت ہے وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ بینک نے ایک طرح سے لین دین کا کام بند کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جائے مگر کاروبار تو کاروبار ہی ہے، یہ آپ کو معلوم ہے۔ میرا کمیشن کیا رہے گا؟ مجھے آپ کے لئے خاص طور پر سفارش کرنی پڑے گی۔ راجہ صاحب کا دوسرے ڈائرکٹروں پر کتنا اثر ہے، یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ مجھے اُن کے خلاف

پارٹی بندی کرنی پڑے گی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ میری ذمہ داری پر معاملہ ہوگا"

رائے صاحب کا چہرہ اُتر گیا۔ کھنّا ان کے خاص دوستوں میں تھے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، ساتھ کے بیٹھنے والے۔ وہ اُن سے کمیشن کی اُمید رکھتے ہیں اتنی بے مروتی! آخر وہ جو اتنے دنوں سے کھنّا کی خوشامد کرتے آتے ہیں۔ تو کس دن کے لئے؟ باغ میں پھل ہوں۔ ترکاریاں ہوں، سب سے پہلے کھنّا کے یہاں بھیجتے ہیں۔ کوئی جشن ہو، کوئی جلسہ ہو، سب سے پہلے کھنّا کو مدعو کرتے ہیں۔ اس کا یہ جواب ہے!

اُداس ہو کر بولے "آپ کی جو مرضی ہو، مگر میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتا تھا"

کھنّا نے ممنونیت کے لہجے سے کہا "یہ آپ کی مہربانی ہے۔ میں نے بھی ہمیشہ آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ کبھی آپ سے کوئی پردہ نہیں رکھا۔ مگر کاروباری فضا ایک اور ہی فضا ہے۔ جہاں کوئی کسی کا دوست نہیں، کوئی کسی کا بھائی نہیں۔ جس طرح میں بھائی کے ناتے آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے دوسروں سے زیادہ کمیشن دیجئے۔ اُسی طرح آپ کو بھی میرے کمیشن میں رعایت کے لئے اصرار نہ کرنا چاہئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جتنی رعایت آپ کے ساتھ کر سکتا ہوں اتنی کروں گا۔ آپ دفتر کے وقت آئیں اور لکھا پڑھی کر دیں۔ بس معاملہ ختم! آپ نے کچھ اور سُنا؟ مہتا صاحب آج کل مالتی پر بے طرح ریجھے ہوئے ہیں۔ ساری فلاسفری نکل گئی۔ دن میں ایک دو بار ضرور ہی حاضری دے آتے ہیں۔ اور شام کو اکثر دونو ساتھ ساتھ گھومنے نکلتے ہیں۔ یہ تو میری ہی شان تھی کہ کبھی مالتی کے دروازے پر سلام کرنے نہ گیا۔ شاید اب اُسی کی کسر نکال رہی ہے۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ جو کچھ ہیں مسٹر کھنّا کے پاس دوڑی آتیں۔ جب روپیوں کی ضرورت پڑتی تو کھنّا کے نام رقعہ آتا۔ اور کہاں اب مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی

ہیں۔ میں نے خاص ان ہی کے لئے فرانس سے ایک گھڑی منگوائی تھی۔ بڑے شوق سے لے کر گیا مگر نہیں لی۔ ابھی کل میووں کی ڈالی بھیجی تھی۔ کشمیر سے منگوائے تھے۔ واپس کر دی مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ آدمی اتنی جلدی کیسے بدل جاتا ہے۔"

رآئے صاحب دل میں تو اُن کی بے قدری پر خوش ہوئے مگر ہمدردی دکھا کر بولے "کہ اگر یہ بھی مان لیں کہ مہتا سے اُنھیں محبت ہو گئی تو قطع مراسم کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔"

کھنّا نے افسوس سے کہا: "یہی تو رنج ہے۔ بھائی صاحب! یہ تو میں شروع ہی سے جانتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آسکتیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی اس کے دھوکے میں نہیں پڑا کہ مالتی کو مجھ سے محبت ہے۔ محبت جیسی چیز اُن سے مل سکتی ہے، اس کی میں نے کبھی امید ہی نہیں کی۔ میں تو صرف اُن کے روپ کا پجاری ہوں۔ سانپ میں زہر ہے، یہ جانتے ہوئے بھی ہم اُسے دودھ پلاتے ہیں۔ طوطے سے زیادہ بے مروت جانور اور کون ہوگا؟ لیکن صرف اس کی شکل اور اس کی آواز پر گرویدہ ہو کر لوگ اُسے پالتے ہیں اور سونے کے پنجرے میں رکھتے ہیں۔ میرے لئے بھی مالتی اسی طوطے کی طرح تھی۔ افسوس یہی ہے کہ میں پہلے کیوں نہ ہوشیار ہو گیا۔ اس کے لئے میں نے ہزاروں روپئے برباد کر دیئے۔ بھائی صاحب۔ جب اس کا پرزہ پہنچا میں نے فوراً روپئے بھیجے۔ میرا موٹر آج بھی اس کی سواری میں ہے۔ اس کے پیچھے میں نے اپنا گھر چوپٹ کر دیا۔ بھائی صاحب، دل میں جتنا رس تھا وہ اُدھر کی طرف اتنی زور سے بہا کہ دوسری طرف کا باغ بالکل خشک ہی رہ گیا۔ برسوں ہو گئے کہ میں نے گوبندی سے دل کھول کر بات بھی نہیں کی۔ اس کی خدمت اور محبت اور قربانی سے مجھے اُسی طرح بدمزگی ہو گئی تھی جیسے بدہضمی کے مریض کو حلوے سے